

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نگار و نظر

پاکستان میں اقوام متحدہ کے زیر نگرانی

## دینی صحافت کے مدیران کی سہ روزہ ورکشاپ

پیش کردہ اُنکار و نظریات کا ناقدانہ جائزہ

اقوام متحدہ کے ادارے Alliance of Civilizations (تہذیبوں کے اتحاد) کے تحت ۱۲ تا ۱۵ اکتوبر ۲۰۰۹ء کے درمیان مشہور تفریحی مقام بھور بن کے پرل کانٹینیئنٹل ہوٹل میں ایک سہ روزہ ورکشاپ کا انعقاد ہوا، جسے واشنگٹن اور برسلز کی این جی او Search for Common Grounds (مشترکہ اساسات کی تلاش) کے اسلام آباد آفس نے منظم کیا تھا۔ سہ روزہ ورکشاپ میں پاکستان کی دینی صحافت کے مشہور جرائد کے مدیران کو شرکت کی دعوت دی گئی تھی۔ افتتاحی سیشن میں ورکشاپ کا مقصد ”دینی صحافت کے مسائل کا ادراک، درکار صلاحیتوں کا فروغ، دینی صحافت کی ضروریات کی تکمیل اور خصوصی مہارتوں کا فروغ“ بیان کیا گیا۔

یوں تو اقوام متحدہ اور اس جیسے مغربی ادارے مسلم اُمہ کے مسائل کو جس مخصوص نظر دیکھتے اور ان کے جیسے بامقصد حل کی تلقین کرتے ہیں، اس کا رخ اہل نظر سے ڈھکا چھپا نہیں ہے، لیکن اپنے موضوع کی اہمیت اور ایسے نامور شرکا کے علم و فضل سے استفادہ اور ان کے ساتھ طویل وقت گزارنے کا یہ پہلا موقع تھا، جن کی تحریریں عرصہ دراز سے پڑھی پڑھائی جاتی ہیں۔ کسی مجلے کے مدیر کی شخصیت، اُنکار و رجحانات اور اذواق اس کے زیرِ ادارت مجلہ اور اس کی تحریر میں بخوبی دکھائی دیتے ہیں، اس لئے بہت سے لوگوں کو ملنے کی خواہش نے راقم کو بھی

اس ورکشاپ میں شرکت پر مجبور کر دیا۔ ایک طویل عرصہ، کم و بیش دس برس کے بعد یہ ورکشاپ دینی صحافت کے مدیران کو مل بیٹھنے کا موقع فراہم کر رہی تھی اور نوجوان اہل علم و قلم کی شرکت اس ورکشاپ کا طرہ امتیاز تھی۔ ۲۲ کے لگ بھگ شرکا میں ہفت روزہ ’الشیخ‘ کے مدیر مرزا محمد الیاس، ماہنامہ ’الشریعہ‘ کے مدیر محمد عمار خان ناصر، ہفت روزہ ’الاعتصام‘ کے مدیر حافظ احمد

شاہر، ماہنامہ 'عرفات' کے مدیر مولانا راغب نعیمی، ترجمان القرآن کے نائب مدیر جناب امجد عباسی، 'الخبر' ملتان کے مدیر مولانا محمد ازہر، ماہنامہ 'السعد' کے مدیر سید طاہر سعید کاظمی (برادر خورد) وفاقی وزیر مذہبی امور، 'اُس آف پیس' کے مدیر قاضی عبدالقدیر خاموش، 'منہاج القرآن' کے مدیر ڈاکٹر علی اکبر ازہری، ماہنامہ 'مِثاق' کے مدیر مرزا ایوب بیگ اور خواجہ شجاع عباس (مدیر ماہنامہ پیام، اسلام آباد) موجود تھے، جبکہ 'الحق' اکوڑہ خٹک، 'ندائے خلافت' لاہور، 'صحفہ اہل حدیث' کراچی اور 'ضیاء حرم' کی مجلس ادارت کے متحرک اراکین بھی شریکِ مجلس تھے۔ اس ورکشاپ میں البلاغ، بینات، الاسلام، الفاروق کراچی اور جماعت الدعوة کے مجلات 'حرمین' و 'جرار' اور 'طیبات' وغیرہ کے مدیران بوجہ شرکت نہ کر سکے۔

ورکشاپ کے انتظامات انتہائی معیاری اور سہولیات سے بھرپور تھے۔ تین روزہ ورکشاپ کے دوران تمام شرکا کو پرل کانٹیننٹل میں اعلیٰ رہائش اور سہ وقتی دعوتِ طعام کا اہتمام تھا، ہوائی سفر اور لانے لیجانے کے تمام انتظامات و اخراجات اقوام متحدہ کے ذیلی اداروں نے برداشت کئے، ایک محتاط اندازے کے مطابق شرکت کرنے والے ہر فرد پر ۷۰ ہزار روپے اور پوری ورکشاپ پر نصف کڑوڑ روپے کے لگ بھگ اخراجات کئے گئے تھے۔

مذکورہ بالا تفصیلات سے اس ورکشاپ کی اہمیت کی نشاندہی مقصود ہے، تاہم اپنے مقاصد میں یہ ورکشاپ کہاں تک کامیاب رہی؟ اس کے بارے میں ایک سے زیادہ آرا ہو سکتی ہیں۔ ورکشاپ میں بیان کردہ موضوعات و اہداف کے بین السطور میں پیشہ ورانہ صلاحیتوں کے ساتھ ساتھ زاویہ فکر کی تبدیلی، مغرب بالخصوص امریکہ کے بارے میں سافٹ کارنر پیدا کرنے کی کوشش، اشارہ کنایہ سے ان کا موقف بیان کرنا اور مغرب میں ہونے والی مادی تحقیقات کو سامعین کے اذہان میں اُنٹیلٹنا وغیرہ تھا۔

راقم الحروف کو تین برس قبل سرکاری دورہ امریکہ اور بعض دیگر عالمی کانفرنسوں میں شرکت کی بنا پر یہ جستجو رہی کہ براہ راست پیغام کے پس پردہ مخفی مقاصد کو پڑھا جائے اور یہ سمجھنے کی کوشش کی جائے کہ پاکستان کی دینی صحافت کے اہم اور حساس اذہان پر یہ سرمایہ کاری آخر کیوں کی جا رہی ہے؟ چنانچہ ورکشاپ کے مختلف سیشنوں کے درمیان لیکچرر حضرات کے

مختلف دعووں اور مواقف کی گہرائی میں اُترنے اور ان پر بے لاگ تبصرہ کرنے کا موقع بھی ملا۔ بعض لیکچرز پر راقم کی خاموشی کے موقع پر مخلص احباب کا یہ اصرار بھی رہا کہ آپ اپنے تبصرے سے ہمیں ضرور مستفید فرمائیے تاکہ تصویر کے دوسرے رخ سے بھی ہمیں آگاہی حاصل ہو سکے۔ پروگرام میں بعض اہم بیانات پر جو تبصرے یا مواخذے کئے گئے، ان میں سے بعض حسب ذیل ہیں۔ ان موقعوں پر مرزا محمد الیاس، حافظ احمد شاکر، مولانا محمد ازہر، مرزا ایوب بیگ اور راقم کا موقف عموماً ایک دوسرے کی موافقت و تائید میں ہوا کرتا۔

❁ ورکشاپ کے پہلے سیشن میں ہر شریک مجلس سے چار سوال پوچھے گئے تاکہ شرکا کے رجحانات اور ان کی تجزیاتی صلاحیت کا ادراک کیا جاسکے۔ تمام شرکا کو چار گروپ میں تقسیم کر کے ان میں سے ایک فرد کو اپنے ساتھیوں کے خیالات کی مشترکہ نمائندگی کا بھی موقعہ دیا گیا۔ راقم نے اپنے سوالات کے مختصر جوابات یوں دیے جبکہ دیگر افراد کی ترجمانی کرتے ہوئے ان کی طرف سے بعض مزید نکات کا اضافہ بھی کیا.....

\* سوال: میں میڈیا میں کیوں آیا؟

جواب: میرا میڈیا میں آنے کا مقصد دین کے پیغام (رسالت) کو غلط مفہیم اور آلائشوں سے پاک کرنا، اور خالص شریعت اسلامیہ کی تبلیغ و ترجمانی کرنا ہے۔ مزید برآں اُمت اسلامیہ کے حالات کا اسلامی نقطہ نظر سے تجزیہ اور اس میں اصلاح احوال کی کوشش کرنا۔

\* سوال: میڈیا میں آپ کی دلچسپی کی چیزیں کیا ہیں؟

جواب: اپنے مقصد میں ہم تک کہاں کامیاب ہیں، اور اس سے استفادہ کا دائرہ کس قدر وسیع ہے۔

\* سوال: میڈیا کے بڑے چیلنج کیا ہیں؟

جواب: قارئین کی دینی رہنمائی کے لئے بہترین اور معیاری مواد پیش کرنا اور امت کے احوال کا حقیقت پر مبنی تجزیہ کرنا۔

\* سوال: عام اور دینی صحافت میں بنیادی فرق؟

جواب: دینی صحافت اللہ کی دعوت کو پھیلانے کے لئے ہوتی ہے جبکہ عام صحافت لوگوں کے باخبر رہنے کی جذبہ کی عکاس اور اسیر ہوتی ہے۔ ابلاغ اور تبلیغ دونوں الفاظ کا مصدر و مادہ

ایک ہی ہے، بلاغ ایک نبوی منصب ہے گویا 'بلاغ' کا مقصد اللہ کے دیے ہوئے پیغام کو انسانیت تک پہنچانا ہی ہے۔

✽ اس موقع پر تمام شرکا کے جوابات سننے کے بعد معاون کار، اظہر حسین صاحب نے دینی صحافت کو 'سٹریم لائن صحافت' سے دور یعنی عوام میں مقبول مرکزی صحافت سے خارج قرار دیا۔ اس پر تبصرہ کرتے ہوئے شرکا نے اسے 'سیکولرزم کا شرعہ' بتلایا جس کی رو سے دین و دنیا کے دو علیحدہ دائرے متعارف کرا کے عوام الناس کی دلچسپی کو دنیوی امور تک محدود کر دیا گیا ہے۔ معاون کار کا سوال یہ تھا کہ اگر آپ میں سے کسی شخص کو مین سٹریم صحافت مثلاً روزنامہ 'ڈاشنگٹن پوسٹ' میں کالم لکھنے کا موقع ملے تو کیا اس کو سیکولر صحافت کا علمبردار ہونے کی بنا پر آپ قبول نہیں کریں گے؟ جس کا جواب راقم نے یوں دیا کہ ایسا دعویٰ ضرورت کی بنا پر تو ہو سکتا ہے، لیکن جہاں تک مسلمانوں کے میڈیا کی بات ہے تو اسے اصولاً ایک ہی ہونا چاہئے جو دین و دنیا کی تفریق اور حد بندیوں سے بالاتر ہو کر، ہر معاملے میں اسلام سے رہنمائی لے کر مسلمانوں تک پہنچائے، نہ کہ میڈیا کا بعض حصہ دین سے بالاتر ہو کر دیگر پس پردہ نظریات کے تحت مسلمانوں تک اپنے پیغامات پہنچائے اور اسلامی فکر و نظر سے بالاتر ہو کر عوامی مقبولیت ہی اس کا طرہ امتیاز ہو۔

✽ جناب اظہر حسین نے اپنے اگلے تربیتی سیشن میں ایک پہاڑ کی تصویر بناتے ہوئے نشاندہی کی کہ جزیرے کا سطح سمندر سے بلند چھوٹا سا حصہ دراصل ایک بڑی سرزمین کا معمولی اظہار ہوتا ہے جسے پہاڑ کی چوٹی سے مماثلت دی جاسکتی ہے، جو اوپر جا کر بہت چھوٹی ہو جاتی ہے۔ اس اظہار اور چوٹی کو انہوں نے کلچر سے تعبیر کیا جس کے پس پردہ متعدد محرکات و عناصر کارفرما ہوتے ہیں جو اس علاقے کی سرزمین سے پھوٹتے ہیں۔ ان کا کہنا تھا کہ کلچر عادات، ثقافت، تاریخ اور نظریات کا مجموعہ ہوتا ہے اور کلچر کا ہمیں معروضی تجربہ کرتے رہنا چاہئے کہ آیا کسی حادثاتی یا اضافی وجہ کی بنا پر ہم بلاوجہ کسی قوم کے بارے میں منفی رویہ تو اختیار نہیں کر رہے۔ انہوں نے امریکہ کے پاکستان کی اصلاح کے لئے کئے جانے والے اقدامات اور مخلصانہ مدد کو سراہتے ہوئے مسلمانوں کو اپنے طرز فکر میں تبدیلی کی تلقین کی۔ انہوں نے کہا

کہ امریکہ نے پاکستان کو ترقی اور انفراسٹرکچر قائم کرنے کے لئے کتنی رقم فراہم کیں، لیکن حکومت کے نمائندگان ان کی تکمیل کی بجائے ہر بار نئے منصوبے اور نئے وعدے لے کر آجاتے ہیں، اس سے امریکہ میں پاکستان کے خلاف فضابینی اور عالمی سطح پر مسلمانوں کی سبکی ہوتی ہے۔

راقم نے اس موقع پر یہ تبصرہ مناسب سمجھا کہ کلچر کی تعریف ہر طبقہ فکر کے لوگ اپنے پس منظر میں کرتے آئے ہیں اور ان کی کوشش رہی ہے کہ دین سے براہ راست ٹکراؤ کی بجائے اسلام مخالف امور کی کلچر کے جھنڈے تلے حمایت حاصل کر کے اُسے گوارا بنایا جائے۔ کلچر درحقیقت ”ایسی روزمرہ عادات و اطوار کا مجموعہ ہے جو کسی گروہ کے غالب حصے میں ظاہری طور پر نمایاں ہو۔“ اس کے تشکیلی عناصر میں مذہب غالب ترین حیثیت رکھتا ہے، جبکہ دیگر محرکات میں علاقائی عادات، تاریخی روایات اور ضابطہ ہائے اخلاق وغیرہ بھی شامل ہیں۔

مسلمانوں میں کلچر کی بحث کے دوران اس امر کی نشاندہی انتہائی ضروری ہے کہ اسلام کی رو سے ہر مسلمان پر دین کی حیثیت دیگر جملہ سماجی عناصر پر غالب تر ہے، البتہ ہر ایسی سماجی روایت جو اسلام سے نہ ٹکراتی ہو، اس کی اسلام میں گنجائش ہے۔ اسلام کلچر کی تشکیل کرتا ہے، نہ کہ خود کلچر کی قوت سے تشکیل پاتا ہے۔ اپنی بھرپور نظریاتی قوت اور مکمل محفوظ ہونے کی بنا پر اسلام تو یہ تقاضا رکھتا ہے جبکہ دنیا کے دیگر مذاہب کے ہاں یہ صورتحال موجود نہیں ہے، جیسا کہ ہندومت میں کلچر ان کے مذہب پر غالب ہے۔ اور عیسائیت بھی کلچرل تقاضوں کے ساتھ مفاہمت کر چکی ہے۔ مزید برآں اسلام ایسی جدید سہولیات، بہتری اور ارتقا (جنہیں تمدن، سولائزیشن یا حضارہ کہنا چاہئے) کو اپنانے کی ترغیب دیتا ہے جن کی اسلام سے کوئی مخالفت نہ پائی جاتی ہو۔

❁ مقرر موصوف کی کسی قوم کے بارے میں منفی جذبات نہ رکھنے کی دعوت کا مقصد پاکستانیوں کو امریکہ کے بارے میں نفرت آمیز جذبات پر نظر ثانی کرنے کی کنایتاً تلقین کرنا تھا۔ اس نکتہ پر مولانا حافظ احمد شاکر نے بہ تفصیل ان وجوہات کی نشاندہی کی کہ مسلم اُمہ امریکہ کے بارے میں بلاوجہ منفی رویے اور نفرت کا شکار نہیں ہے۔ نہ صرف مسلمان بلکہ پوری دنیا میں

امریکہ مخالف جذبات کی وجہ امریکہ کے ظالمانہ، توسیع پسندانہ اور خالص مفاد پرستانہ رویے ہیں جن کی ایک لمبی تاریخ ہے۔ گذشتہ ۱۲۰ سالوں میں امریکہ ۵۷ آزاد ممالک پر فوج کشی اور جارحیت کا مرتکب ہوا ہے، گذشتہ ۶۰ برسوں میں ۲۸ ممالک کی سرزمین پر براہ راست بمباری کر چکا ہے۔ جب تک امریکہ اپنے جارحانہ رویے، مذموم سیاست، بدترین بربریت اور طاقت کی زبان استعمال کرنا ترک نہیں کرتا، دنیا میں امریکہ کے خلاف نفرت میں اضافہ ہی ہوتا رہے گا۔

یہاں راقم نے یہ اضافہ کیا کہ جہاں تک معاہدوں پر عمل درآمد اور ترقی نہ ہونے کا تعلق ہے، تو امریکہ کی یہ شکایت درست نہیں۔ کیونکہ ترقی کے نام پر ہونے والے معاہدے دراصل امریکی اثر و رسوخ میں اضافے اور مغرب نوازی کے پس منظر میں تشکیل پاتے ہیں جو اکثر ہماری قومی روایات اور ملی اقدار کے منافی ہوتے ہیں۔ ان معاہدات کا بڑا حصہ مشاورت و نگرانی اور اپنی تجارتی کمپنیوں کی شرط کے نام پر امداد دینے والے ممالک میں ہی واپس چلا جاتا ہے۔ بالخصوص اس مقصد کے لئے موزوں افراد کی بجائے اپنے نقطہ نظر کے افراد کو نوازا جاتا ہے اور اس کے بعد کام نہ ہونے کا الزام اہل پاکستان پر عائد کر دیا جاتا ہے۔ آج اُمتِ مسلمہ پر بد نظمی، بد حالی، بے انصافی، اقربا پروری، لاقانونیت اور ظلم و ستم کا الزام عائد کیا جاتا ہے، لیکن کیا مسلم اُمہ کے ان حکمرانوں کے انتخاب، بقا اور مسلط رہنے میں عالمی سامراج کا کوئی کردار نہیں ہے؟ آج عالمی سامراج مسلم اُمہ کے مسائل میں مفاد پرستانہ دخل اندازی ختم کر دے اور مسلمانوں کو عوام کے حقیقی منتخب افراد مہیا کرنے کی گنجائش میسر کرے، تو دنوں میں یہ ساری صورتحال تبدیل ہو سکتی ہے۔

✽ جناب اظہر حسین کے لیکچر کا دوسرا حصہ عدل و انصاف کی تلقین پر مبنی تھا۔ انہوں نے مغربی اقوام کے عدل گسترانہ رویوں کی تعریف کرتے ہوئے پاکستان میں عدل کے اداروں اور انصاف کی ناگفتہ بہ صورتحال کی نشاندہی کی۔ مزید برآں انہوں نے ۱۰ منٹ پر مشتمل ایک ویڈیو حاضرین کو دکھائی جس میں امریکہ میں نسل پرستانہ رویوں کے خاتمے کی جدوجہد کو فلما یا گیا تھا۔ انہوں نے نسلی اور گروہی ہر قسم کے امتیاز Discrimination کو ختم کر کے

ریاست کے لئے متحد ہو کر کام کرنے کی اہمیت پر زور دیا۔

موصوف کا یہ اظہار یہ بھی قابل وضاحت تھا، اس بنا پر راقم نے اولاً تو عدل کے ضمن میں یہ وضاحت کی کہ اقوام عالم میں عدل کی ضرورت واہمیت پر کوئی دوسری رائے نہیں ہو سکتی اور عدل وانصاف کسی بھی معاشرہ کا پہلا تقاضا ہے، لیکن اسلام کی رو سے اصل نکتہ محض عدل کا قیام نہیں، بلکہ عدل کی میزان کا ہے اور یہ نکتہ کافی اہمیت کا حامل ہے۔ اسلام کی رو سے حقیقی عدل صرف اللہ کی شریعت (کتاب اللہ) پر ہی ہونا ممکن ہے، اس کے سوا عدل کے دیگر میزانات ظاہری، محدود اور غیر متوازن انصاف مہیا کرتے ہیں۔ عالمی استعمار سیکولرزم کا علم بردار اور نگہبان ہونے کی بنا پر کسی بھی مسلم ریاست میں کتاب اللہ کو عدل کے بنی بنانے کی کسی گنجائش میسر آنے کا روادار نہیں، اور مغربی اقوام کا یہ رویہ مذہبی آزادی کے دعویدار ہونے کے ناطے سراسر ظالمانہ ہے۔

علاوہ ازیں امتیاز کے خاتمے کے سلسلے میں یہ بات ملحوظ رہنا ضروری ہے کہ ہر قوم کے امتیاز کا نظریہ اس کے مرکزی مقصد و ہدف سے مربوط ہوتا ہے اور وہ اسی امتیاز کے خاتمے کی بات کرتی ہیں۔ چونکہ مغربی اقوام نظریہ قومیت و وطنیت کی ان تھک علم بردار ہیں اور نیشنلزم ان کے فکر و نظریہ کا بنیادی ستون ہے، اسی لئے کسی ایک وطن کے باشندوں میں کسی قسم کے نسلی، گروہی حتیٰ کہ مذہبی اساسات پر گروہ بندی کی بھرپور مخالفت پائی جاتی ہے اور تمام کو ایک قوم بن کر مادر وطن کی خدمت کی پر زور تلقین کی جاتی ہے اور وطن کے حقوق کو ہی بالاترین حق باور کرایا جاتا ہے۔ اس کے بالمقابل اسلام کا نظریہ امتیاز اللہ کی بندگی اور اس کے دین کی اطاعت و عبادت سے منسلک وہم آہنگ ہے۔ کالے و گورے، عربی و عجمی اور امیر و غریب کی بنا پر ہمارے نبی کریم ﷺ نے بھی ہمہ نوعیتی امتیاز کی نفی کر کے اسے جاہلیت قرار دیا ہے، لیکن وطن اور دھرتی سے محبت کی بجائے ایک اللہ کی بندگی کرنے والوں کو باہمی اخوت میں پرویا ہے۔ اسلام نے اللہ کی بندگی (تقویٰ) اور اللہ کی کتاب کے تعلیم و تعلم کی بنا پر انسانوں میں فضیلت کی درجہ بندی کی ہے۔ اسی طرح کفار و مشرکین کو قرآن کریم نے شرک و گناہ کی غلاظت کی بنا پر نجس قرار دیا ہے اور مسلمانوں کو ان کی دوستی سے منع کر کے، اسلام کی بنا پر ایک

عالمی ملت کی تشکیل کی ہے۔ اس عالمی ملت میں افتراق کی دعوت چاہے وہ ممالک کی سرحدوں کی بنا پر ہو، یا رنگ و نسل کی بنا پر، یہ امر اسلام میں ناقابل قبول ہے۔ الغرض امتیاز Discrimination کی نفی کی تلقین کرتے ہوئے مسلمانوں کو اپنے محور امتیاز اور غیر مسلموں کے نفی امتیاز میں فرق کو واضح رکھنا چاہئے۔

یاد رہنا چاہئے کہ جدید مغربی ریاست کسی بھی فکر و نظریہ کی بنا پر امتیاز کی نفی کرتی حتیٰ کہ مذاہب کے مابین امتیازات کو بھی فرقہ واریت قرار دے کر اس کی بیخ کنی کرتی ہے اور مادر وطن کے باشندوں اور دیگر ممالک کے رہائشیوں کو برابر کا انسان ہی تسلیم نہیں کرتی۔ جدید فکر و تہذیب پر ایمان رکھنے والا انسان ریاست کے حق کو سب سے بالا تر قرار دیتا ہے جس میں انسان نے جنم لیا، جبکہ اسلام پر یقین رکھنے والا فرد خالق کے حق (ہدگی) کو اولین فرض سمجھتا ہے، جو انسان و دھرتی سمیت، ساری کائنات اور اس کے ماں باپ تمام کا خالق و مالک اور رازق ہے۔ جدید ریاست، ریاست کے باغی کو جینے کے حق سے محروم کر دیتی ہے، اور اسلام اپنے ماننے والے کے مخرف و مرتد ہونے پر اس کے مباح الدم ہونے کا نظریہ پیش کرتا ہے۔ اسی نوعیت کے تبادلہ افکار پر مشتمل ۱۳ اکتوبر کو ورکشاپ کا پہلا دن اختتام کو پہنچا۔ پہلے لیکچر کے دوران ہی ہمیں اسلام آباد میں پروفیسر عبد الجبار شاہ کی رحلت کی افسوسناک خبر موصول ہوئی۔ اس خبر کو سنتے ہی ہفت روزہ 'الاعتصام' کے مدیر حافظ احمد شاہ کران کی نماز جنازہ میں شرکت کے لئے شیٹوپورہ روانہ ہو گئے اور بعد کے دنوں میں ان سے ملاقات نہ ہو سکی۔

اگلے دن ایف سی کالج، لاہور کے شعبہ دینیات کے چیئر مین پروفیسر حافظ عبد الغنی اور چیئر مین شعبہ ابلاغیات جناب سلیم قیصر عباس کے دو لیکچرز تھے۔ جبکہ بعد ازاں یہاں پر سید راشد شاہ بخاری (نمائندہ 'سراج فار کاسن گراؤنڈ') کا بھی لیکچر تھا۔

اسلام ایک جامع و کامل علیت کا نام ہے، جو قرآن و سنت سے براہ راست مستفید ہے، اس کے بالمقابل مغربی تہذیب انسانی فکر و فلسفہ کی پرزور داعی ہے۔ ظاہر ہے کہ جب بھی دو مختلف اہداف و مقاصد اور سرچشموں سے کسی نظریہ کا جائزہ لیا جائے گا، تو لب و لہجہ، حرف و کنایہ اور مقصود و مدعا میں اختلاف لازمی امر ہے۔ کسی ظاہر بین سے یہ اختلاف ایک حد تک چھپا رہ

سکتا ہے، لیکن دونوں نظامہائے حیات کا معمولی سا جائزہ و تجربہ رکھنے والا شخص رجحانات کے اس اختلاف کو فوراً بھانپ لے گا۔ ایسی ہی صورتحال بعد کے محاضرات کے دوران بھی رہی۔

✽ حافظ عبدالغنی ایک مشہور امریکی مستشرق سے مختلف نظریات کی باقاعدہ تربیت لے چکے ہیں، اور اس میں سے ہی بعض نظریات انہوں نے حاضرین کے سامنے پیش کئے۔

انہوں نے لیکچر کے آغاز میں امن کی تلقین اور اس کی اہمیت و ضرورت پر روشنی ڈالی۔ پرامن رہنے کے سلسلے میں انہوں نے 'ایک بہترین دعا' کا عربی متن حاضرین کے سامنے پیش کیا۔ پرامن رہنے کے بارے میں بتاتے ہوئے انہوں نے کہا کہ ہمیں پرسکون رہنے اور اپنے حالات پر زیادہ کڑھنے سے گریز کی ضرورت ہے۔ ہمارے ذہن کو اطمینان سے بھرپور اور بے چینی سے پاک ہونا چاہئے، تبھی ہم اپنے فرائض کو بہتر طور پر انجام دے سکتے ہیں۔

راقم نے اس پر یہ تبصرہ کیا کہ مقرر موصوف کی یہ تلقین واقعتاً مفید اور اہم ہے، لیکن اس کے لئے انہوں نے درست مخاطبوں کا انتخاب نہیں کیا۔ دینی صحافت کے مدیران درحقیقت تحریری میدان میں امت کے حالات کی اصلاح کے لئے کوششیں بروئے کار لا رہے ہیں اور اپنے اوپر عائد ہونے والے دینی فریضہ کی تکمیل میں منہمک قیادت ہیں۔ اگر اسوۂ نبوی کو دیکھا جائے تو امت کے حالات پر فکر مند ہو کر، ان کی گمراہی کے بارے میں نبی اکرم ﷺ کی فکر مندی اس قدر حد سے بڑھی ہوئی تھی کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں کئی مقامات پر آپ کو یہاں تک کہا کہ شاید اس طرح آپ ﷺ اپنے آپ کو ہلاکت کا شکار نہ کر بیٹھیں۔ کوئی بھی قائد جب تک اصلاح احوال کے لئے شدید درجہ کی بے چینی اور کڑھن اپنے دل میں محسوس نہ کرے، اس وقت تک وہ اپنی قوم کو مصائب و مشکلات سے نہیں نکال سکتا۔ یہ درست ہے کہ کسی بھی قائد کے اقدامات جوش سے زیادہ ہوش اور دانش مندی پر مبنی ہونے چاہئیں لیکن فکر مندی کے حالات میں پرسکون اور مطمئن رہنے کی دعوت ملی ضرورت سے زیادہ شخصی مفاد سے وابستہ ہے۔

حافظ صاحب کی پیش کردہ عربی دعائے امن کے بارے میں جب یہ استفسار کیا گیا کہ یہ دعا اسوۂ نبوی میں ہمیں کہاں مل سکتی ہے، یا صحابہ و خیر القرون اور ائمہ اسلاف رحمہم اللہ میں

سے کس نے اس کی تلقین کی ہے، تو جناب مقرر عربی زبان میں ہونے کے سوا اسلام سے اس کی قربت کی کوئی دلیل و وضاحت پیش نہ کر سکے۔

اس موقع پر راقم کو دو برس قبل دسمبر ۲۰۰۷ء میں لاہور کے دینی مدرسہ دارالعلوم الاسلامیہ، کامران بلاک میں اسی ورکشاپ کے روح رواں حضرات کی زیر نگرانی 'جدوجہد برائے امن' نامی ایک پروگرام میں شرکت کا موقع یاد آگیا۔ جب یہ حضرات مختلف دینی مدارس سے وابستہ افراد کو اپنے نصاب میں امن پر مبنی تعلیمات کی بھرپور تلقین کر کے اس کے لئے ایک مستقل نصاب وضع کرنے پر اصرار کر رہے تھے۔ اس موقع پر راقم نے یہ تبصرہ کیا تھا کہ ان حالات میں جب پاکستان بدترین امریکی جارحیت کا سامنا کر رہا ہے اور یہ جارحیت افغانستان و عراق میں بدترین قتل و غارت کی شکل دھار چکی ہے، افغانستان و عراق میں امریکی بربریت کے نتیجے میں بالترتیب ۱۲ لاکھ عراقی اور ۶ لاکھ افغانی لقمہ اجل بن چکے ہیں، محبت دین و ملت طبقات اس بارے میں فکر مند اور مزاحمت برائے بقا کی کوششوں میں شریک ہیں، ان حالات میں باامن رہنے کی معنویت زمانی سیاق و سباق سے بالکل بعید تر دکھائی دیتی ہے۔ امن کی اس بے وقت کی دعوت کا مطلب تو یہ دکھائی دیتا ہے کہ ہمارے گھر پر پتھراؤ اور بدترین جارحیت ہو رہی ہو اور گھر والے اپنے باامن رہنے کا راگ الاپ رہے ہوں یا انہیں اس کی تلقین کی جا رہی ہو۔ اس تلقین کو امن کی بجائے بے غیرتی اور ہاتھ پر ہاتھ دھر کر دشمن کے سر پر آہنچنے کے انتظار سے تعبیر کرنا زیادہ موزوں ہوگا۔ ظلم و جارحیت سے متاثرہ ملت ہونے کے ناطے ہمیں اس وقت گہرے غور و خوض سے اس امر کا تعین کرنا چاہئے کہ مسلمان عوام و خواص کو نسا رو یہ اپنائیں جس سے وہ اس ہلاکت و جارحیت سے بچ سکتے پر قادر ہوں۔

اس وقت بھی میری رائے یہ تھی کہ حکومتوں کو مالی مفادات کا لالچ اور سیاسی مجبوریوں میں الجھا کر دوسری طرف عامۃ المسلمین کے لئے امریکی حکمت عملی یہ وضع کی گئی ہے کہ احتجاج کے ممکنہ مراکز میں تلقین امن کر کے عوام الناس کے کرب و اضطراب کو کم کیا جائے۔ ظاہر ہے کہ اس حکمت عملی کی تردید کا یہ واحد مطلب نہیں کہ لازماً بھڑ جایا جائے اور جواباً تشدد کو اپنایا جائے، بلکہ اس کے لئے ایسی منظم اور موزوں حکمت عملی ہی ضروری ہے جس سے اس ظلم کا

سدا بپ ہو جائے اور ایسے گھمبیر حالات میں ہم پر عائد فریضہ بھی پورا ہو جائے۔ راقم کے اس اصرار کا یہ نتیجہ نکلا کہ دو برس قبل بھی دینی مدارس کے لئے ہونے والا یہ پروگرام قیام امن کے لئے دینی مدارس میں نصاب کی تیاری کے بغیر ہی ختم ہو گیا۔

✽ حافظ عبدالغنی صاحب نے اپنے خطاب میں حاضرین کو علم و رشد کی تلقین کرتے ہوئے انسانیت کے ادوار کی تقسیم پر یہ نظریہ پیش کیا کہ انسانوں کی ترقی اور تہذیب کے حوالے سے معلوم تاریخ کو ہم چار ادوار میں تقسیم کر سکتے ہیں:

ابتداءے آفرینش میں تمام انسانوں کی زندگی کا دار و مدار شکار پر تھا، اس دور کو ہم Hunting Age (شکاری دور) سے تعبیر کر سکتے ہیں، جب ہر انسان کی کامیابی اس کی قوت اور زور بازو کی مرہون منت تھی۔ اس دور کی علامت Symbol تیرکمان ہے۔ انسانیت کا دوسرا دور کاشتکاری کا ہے جس کی علامت 'ہل' ہے، یہ زراعت کا دور ہے جس میں برتری کا انحصار زمین، کھیتی باڑی اور اناج کی پیداوار پر تھا۔ اسے Agriculture age سے یاد کیا جاتا ہے، انسانوں کی یہ صورت حال قرون وسطیٰ تک جاری رہی۔ انسانوں کی ترقی کا تیسرا دور علم و تعلیم اور صنعت و حرفت کا ہے جو احیائے علوم کی تحریک سے شروع ہوا، اسے Knowledge age قرار دیا جاتا ہے۔ اس دور کی علامت 'کمپیوٹر' ہے۔ اس دور میں انسانوں نے تہذیب و ترقی کی عظیم منزلیں طے کیں اور بے شمار ادارے تشکیل دیے۔ اب ہم جس دور کی طرف بڑھ رہے ہیں، وہ تجزیہ و تقابل اور توازن کا دور ہوگا، جس میں انسانیت اپنے معراج پر پہنچ جائے گی، اس دور کی علامت 'کمپاس' ہوگا اور اس کو Wisdom Age سے موسوم کیا جائے گا۔ آنے والے زمانہ میں وہی کامیاب ہوگا جو ان خصوصیات کو اختیار کرے گا۔

لیکچر موصوف نے اس نظریے کی مزید تفصیلات بھی بیان کیں، لیکن راقم نے اس سے اختلاف کرتے ہوئے یہ موقف پیش کیا کہ تاریخ و زمانہ کی یہ خالصتا مادی، مغربی اور غیر حقیقی تقسیم ہے، جسے بطور مسلمان قبول نہیں کیا جاسکتا۔ اس تقسیم کی رو سے بہترین دور آنے والا ہے، اور خیر و شر کے مابین نقطہ فاصل مغرب کی تحریک احیائے علوم کو قرار دیا گیا ہے جو کہ

درست نہیں۔ اسلام کی رو سے خیر القرون، نبی کریم ﷺ کا دور تھا، اس کے بعد صحابہ کا زمانہ اور پھر تابعین کا زمانہ بہترین اُردوار تھے، پھر انسانیت آہستہ آہستہ زوال کی طرف گامزن ہوتی جا رہی ہے۔ ایسے ہی اہل مغرب جن قرون وسطیٰ کو Dark Age یا ظالمانہ دور سے تعبیر کرتے ہیں، مسلمانوں کے نزدیک وہ علوم کا سنہرا دور ہے۔ دراصل ان کی یہ تعبیر اہل مغرب کے لحاظ سے بالکل درست ہے کہ وہ اس وقت ظلم و ستم کا شکار اور جہالت کے اندھیروں میں ڈوبے ہوئے تھے، لیکن اہل اسلام کے اعتبار سے سراسر غلط ہے۔

سب سے پہلے دور کو شکار کا دور قرار دینا بھی غیر اسلامی نظریہ ہے، کیونکہ اسلامی تعلیمات کی رو سے سب سے پہلے انسان حضرت آدمؑ انسانیت کے لئے اللہ کی ہدایت و رہنمائی لے کر آئے، اور انسانیت کبھی بھی رہنمائی سے محروم نہیں رہی۔ ہمیشہ سے نیک انسان موجود اور خیر و شر کے مابین کشمکش برقرار رہی ہے۔ شکاری دور کا نظریہ ان لوگوں کا ہے جو انسان کو ڈارون کے نظریہ ارتقا کے مطابق بندروں کی اولاد قرار دیتے اور اسے آہستہ آہستہ حیوانیت سے انسانیت کی طرف ترقی کرتا ہوا دکھانا چاہتے ہیں۔

ایسے ہی چوتھے دور کو انسانیت کی معراج قرار دینا بھی درست نہیں۔ انسانیت کی معراج اللہ کی بندگی میں ہے، نہ کہ خواہش نفس کی بندگی اور مادی ترقی میں جو دراصل جاہلیت جدیدہ کی معراج ہے۔ انسان کی معراج نماز اور اللہ کی اطاعت میں ہے جب وہ اپنے مقصد حیات کی باحسن تکمیل کر رہا ہو۔ توازن و اعتدال کا مصدر و سرچشمہ اللہ کی ہدایت اور نبی کریم ﷺ کی رہنمائی کے علاوہ اور کیا ہو سکتا ہے، اس کے ماسوا سب کچھ انسانوں کی افراط و تفریط ہے۔

جاہلیت اور علم کی روشنی کے مابین احیاء علوم کی مغربی تحریک کا نقطہ فاصل بھی سراسر غلط ہے۔ جاہلیت کا خاتمہ نبی کریم ﷺ نے خطبہ حجۃ الوداع میں زمانہ جاہلیت کے تمام رسوم و رواج کو اپنے پاؤں تلے روند کر کیا تھا، اور اس کے بعد علم و عمل کا سورج طلوع ہو گیا تھا۔ جبکہ احیاء علوم کو روشنی قرار دینے کا نظریہ اسلام کو جہالت سے متمم کرنے کا دعویٰ ہے۔ احیاء کی اس مغربی تحریک کا مرکز نبی اور اساسی نکتہ علم کو اللہ کے وحی والہام سے نکال کر انسانوں کے حواس و عقل کا اسیر بنانا تھا، اور مغرب کی تمام تر موجودہ ترقی اسی نظریے کے مرہون منت ہے

جو دین بیزار و دین مخالف ہے۔ راقم نے مقرر موصوف کو یہ تلقین کی کہ انہیں مسلم صحافتی قیادت کو ایسے نظریات سکھانے سے گریز کرنا چاہئے جن کی ہمارے عقیدہ و نظریہ میں کوئی گنجائش نہیں ہے۔ شعبہ دینیات کے سربراہ ہونے کے ناطے انہیں ان نظریات کو اسلام کی میزان پر پرکھ کر پیش کرنا چاہئے، نہ کہ ہر غلط سلط نظریہ کو قبول کر لیا جائے۔ ہر قوم کے نظریات اس کے تصور اور مقصد حیات سے بندھے ہوتے ہیں، اور وہ اپنے ان تصورات کے تحت اپنے نظریات تشکیل دیتی ہے۔ ایک مسلمان کا تصور حیات جب ایک غیر مسلم سے سراسر مختلف ہے تو دونوں کے فکری نظریات میں ہم آہنگی کیوں کر ہو سکتی ہے؟

باقی ڈیڑھ دن بھی اسی نوعیت کا تبادلہ خیال چلتا رہا، جن پر دیگر شرکاء بھی آزادانہ اپنے خیالات کا اظہار کرتے۔ بالخصوص آخری دن پاکستان میں امریکی مداخلت کے موضوع پر بڑا سرگرم مباحثہ ہوا، جس میں مرزا ایوب بیگ اور جناب امجد عباسی نے بھرپور حصہ لیا۔ ورکشاپ میں بعض لیکچرز خالصتاً پیشہ وارانہ فنی نوعیت کے تھے جن میں جناب سید راشد بخاری کا لیکچر 'اداریہ نویسی' پر بطور خاص مفید رہا۔ جناب سلیم قصیر عباس نے انٹرویو تکنیک، متوازن اور مؤثر تحریر کے اصول کے موضوع پر لیکچر دیا۔ منتظمین سے ہم نے یہ مطالبہ کیا کہ میدان صحافت کے نامور ماہرین کو بھی اس نوعیت کے ورکشاپس میں دعوت دی جانا چاہئے تاکہ ان کے علم اور تجربات سے بھی ہم کچھ سیکھ سکیں۔

● پروگرام کے بقیہ اوقات میں شرکاء کی باہمی مجالس میں یہ طے پایا کہ لاہور میں دینی صحافت کے سرکردہ افراد کی ایک سہ ماہی ملاقات کا پروگرام تشکیل دیا جائے، اس سلسلے میں ہر حلقہ فکر کو نمائندگی دیتے ہوئے جناب راغب نعیمی، محمد عمار ناصر، مرزا محمد الیاس، مرزا ایوب بیگ اور راقم الحروف پر ایک کمیٹی تشکیل دی گئی، جن کی آئندہ ملاقات لاہور میں ہونا قرار پائی۔ پروگرام کے روح رواں، جناب اظہر حسین اور سید راشد علی بخاری صاحبان تھے، جن کے ساتھ قاضی عبد القدیر خاموش اور حافظ حسین احمد کے بلوچستان سے ایک قریبی عزیز کی مشاورت ہوتی رہتی۔ اس سے قبل بھی یہ حضرات دینی مدارس میں مختلف نوعیت کی ورکشاپس منعقد کرتے رہتے ہیں، اول الذکر دونوں صاحبان سے پانچ برس قبل محترم پروفیسر خورشید احمد

کے ادارہ انسٹیٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز کے معاونین کے طور پر ملاقاتیں ہوتی رہیں، ان کے ہمراہ بعض ورکشاپوں میں بھی شریک ہونے کا موقع ملا، بالخصوص واشنگٹن میں جناب اظہر حسین سے کئی گھنٹوں کی نشست ہوئی۔

پروگرام کے آخری لمحات میں راقم نے ان حضرات سے ازراہ نقض یہ تبصرہ کیا کہ آپ دینی مدارس اور دینی صحافت کو نئی راہ عمل دینے کی کوشش پر اپنا وقت بے جا صرف کر رہے ہیں۔ اُمتِ مسلمہ کا مسئلہ پالیسی اور ہدف کا نہیں بلکہ بد نظمی، بے عملی اور جہالت کا ہے۔ پالیسی تو ہمارے پاس اوّل روز سے بڑی شاندار موجود ہے جو کتاب و سنت جیسے نسخہ کیسیا پر مخلصانہ عمل ہے، جب بھی مسلم اُمت نے اجتماعی یا انفرادی طور پر اس کے کسی حصہ پر عمل کیا ہے، کامیابی نے آخر کار اس کے قدم چومے ہیں۔ مسلم قوم اگر اس عظیم الشان دستورِ حیات پر عمل نہ کرے آج خائب و خاسر اور شرمندگی کی تصویر بنی کھڑی ہے، تو ایک غیر قوم کی پالیسی اور طرزِ فکر اس کو تباہی عمل کا وبال کیوں کر ختم کرنے پر قادر ہے؟ اس لئے ضرورت اس امر کی ہے کہ مسلم قوم کے افراد کو حصولِ علم، فراہمیِ عدل، محنت کی عظمت اور اللہ کی بندگی پر دوبارہ لوٹایا جائے۔ انفرادی اصلاح سے لے کر مسلمانوں کے اجتماعی ڈھانچوں تک کو راست اقدامات کی تلقین کی جائے۔ عوام و حکمران اپنے ذاتی اغراض و مفاد سے نکل کر، اپنی ملت کی دینی و دنیوی تشکیل و تعمیر کی طرف معمولی سی توجہ بھی کریں تو ملتِ اسلامیہ چند برسوں میں اپنا کھویا مقام حاصل کر سکتی ہے۔ اس سلسلے میں ایران، سعودی عرب اور ملائیشیا کے مسلم حکمرانوں کی کاوشیں ہماری آنکھیں کھول دینے کے لئے کافی ہیں۔

یہ تصور کہ اسلام اس دور کے ساتھ نہیں چل سکتا، اس لئے اس کی تشکیل نو کی ضرورت ہے، غیروں کا مسلط کردہ ایک تصور ہے، جو کالونیل ازم کے تحتاتے کے بعد فرسودہ ہو چکا ہے، اسلام میں ہر اس بات کی ترغیب و تلقین موجود ہے جس سے قوموں کی تعمیر و ترقی وابستہ ہے۔ سائنس و ٹیکنالوجی سے لے کر علمِ فن کے ہر پہلو کی اسلام میں شدید حوصلہ افزائی پائی جاتی ہے، ان حالات میں غیروں کے فلسفہ ہائے ترقی اور مختلف ماڈلز کو متعارف کرانے کا اس حد تک فائدہ تو ہو سکتا ہے کہ اس کی تکمیل کے لئے ہمیں خیرات کے چند سکے باسانی حاصل ہو جائیں، لیکن یہ

ترقی آخر کار انہی کے کنٹرول اور اہداف و مقاصد کی تکمیل کا سبب بنے گی اور اللہ کے مطیع و فرمانبردار ہونے کا اعزاز چھیننے کے ساتھ ساتھ ہمیں اہل مغرب کا حاشیہ نشین بنا کے چھوڑے گی۔ اس لئے ضرورت اس بات کی ہے کہ اگر ہم اپنی قوم کی اصلاح چاہتے ہیں تو نئے نظریات کی بجائے کتاب و سنت سے راہنمائی حاصل کر کے، قوم کو اس کی تلقین پر اپنا وقت صرف کریں۔

میرے مخاطب کو اصولاً تو میری اس بات سے اتفاق تھا، لیکن ان کا کہنا تھا کہ اسلامی نظریات کے مطابق ملی تعمیر اور آگے بڑھنے کے لئے کوئی ادارہ ان کو مالی یا تنظیمی سرپرستی دینے کو آمادہ نہیں ہے۔ انہوں نے کہا کہ ہم نے گزشتہ ماہ ایسا ہی ایک پروگرام سعودی عرب کے شہر ریاض میں بھی منعقد کیا ہے، اور او آئی سی (اسلام کانفرنس تنظیم) کو بھی ہم نے اس طرح کے تربیتی پروگراموں کی سکیس پیش کی ہیں، لیکن ان کا مسئلہ یہ ہے کہ مسلمانوں کے ایسے با وسیلہ ادارے کچھ کرنے کی بجائے صرف رسمی مجالس منعقد کرنا چاہتے ہیں۔ یہ لوگ قوت فکر اور جذبہ عمل سے محروم ہیں۔

مستقبل میں بھی اقوام متحدہ کے زیر نگرانی پاکستان کی دینی صحافت کے نامور افراد کی ورکشاپ نیپال میں اور بعد ازاں کسی خلیجی ریاست میں منعقد کرنے کا منصوبہ ہے۔ جن میں سے اول الذکر تو جنوری کے پہلے ہفتے منعقد ہو چکی ہے، جبکہ آخری ورکشاپ کا شیڈول عنقریب جاری ہونے والا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اصلاح احوال کی توفیق دے۔ (ڈاکٹر حافظ حسن مدنی)

### خریدارانِ محدث توجہ فرمائیں

خریدارانِ محدث کو مدتِ خریداری ختم ہونے کی اطلاع بذریعہ پوسٹ کارڈ دی جاتی تھی اب قارئین کی آسانی کے لیے مزید محدث کے لفافہ پر چسپاں ایڈریس میں بھی زیر سالانہ ختم ہونے کی اطلاع دی جاتی ہے۔ لہذا جن حضرات کو دسمبر ۲۰۰۹ء اور مارچ ۲۰۱۰ء سے مدتِ خریداری ختم ہونے کی اطلاع دی گئی ہے۔ ازراہ کرم اولین فرصت میں زیر تعاون بھیج کر تجدید کروائیں۔ **لشکرِ حق**

منجانب: محمد اصغر، منیجر باہنامہ 'محدث'، لاہور، فون: 0305-4600861